شکوہ و جواب شکوہ

ایک مطالعہ

ڈاکٹر مولانا محمد صدر الحسن ندوی مدنی

IIIS
Aurangabad. (M.S.)
معہد الدراسات الاسلامیہ العالمیہ

SHIKWAH -O- JAWABE SHIKWAH

Ek Mutalea

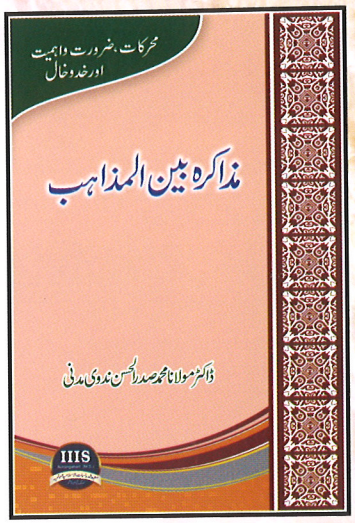

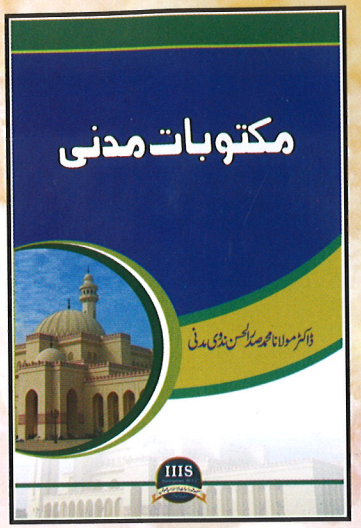

IIIS
Aurangabad. (M.S.)
معہد الدراسات الاسلامیہ العالمیہ

INTERNATIONAL INSTITUTE OF
ISLAMIC STUDIES AURANGABAD. (M.S.)

سلسلۂ مطبوعات معہد الدراسات الاسلامیہ العالمیہ.....:۴۹

شکوہ اور جواب شکوہ

ایک مطالعہ

مولانا ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

سن اشاعت: ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء
Global Art Publication, Aurangabad
ISBN:978-81-931738-3-1

کتاب :شکوہ وجواب شکوہ: ایک مطالعہ
مؤلف :ڈاکٹر مولانا محمد صدر الحسن ندوی مدنی
M.9423153573, 8390989303
ای میل EmailID:madnisadrulhasan@gmail.com
کمپوزنگ :سید اشفاق علی۔ M.No.9890014729
ندا کمپیوٹرس، اعظم کالونی، روشن گیٹ، اورنگ آباد (M.S.)
صفحات :۴۸
قیمت :Rs.50/-
مطبوعہ :سویرا آفسیٹ، اورنگ آباد
زیر اہتمام :معہد الدراسات الاسلامیہ العالمیہ، ۶۳/عارف کالونی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ملنے کے پتے

(۱) شالیمار کتاب گھر۔ روشن گیٹ اورنگ آباد (۲) مکتبہ اسلامی، شاہ گنج اورنگ آباد
(۳) مرزا اورلڈ بک۔ جنسی روڈ، اورنگ آباد (۴) شالیمار بک ہاؤس، ٹی چوک، اورنگ آباد
(۵) پرویز بک ڈپو۔ بڑی لین، اورنگ آباد (۶) ندوی کتاب گھر۔ پربھنی 9860985891
(۷) فیض بک ڈپو۔ جلگاؤں 9325150211

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد:

اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبالؔ ایک آفاقی شاعر تھے اور قدرت نے انھیں اس زمانہ میں، جب عالم اسلام دور انحطاط سے گزر رہا تھا اور علمی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے اس کی بے توقیری اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ چکی تھی۔ ضرب کلیم، بال جبرئیل، ارمغان حجاز اور بانگ درا کا نسخہ کیمیاء لے کر بھیجا۔ اس کی حدی خوانی اور نے نوائی نے بخت خفتہ کو خواب گراں سے بیدار کیا۔ اس نے ملت اسلامیہ کے نوجوانوں، شاعروں، ادیبوں، علماء، دانشوروں، صوفیاء اور اصحاب حل وعقد کو اپنی فکر وعمل کا محور بنایا۔ ہندی نغمہ میں اس کی حجازی لے لوگوں کو اس قدر بھائی کہ وہ شاعر اسلام کے لقب سے نوازا گیا۔

شکوہ اور جواب شکوہ اسی شاعر اسلام کی حسرتوں اور امنگوں کا ایک برہنہ اظہار ہے

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

اور جواب شکوہ اس کا منتہائے کمال:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبال اکیڈمی اورنگ آباد مہاراشٹر کے توسط سے میں تقریباً بیس سال سے پابندی کے ساتھ کلام اقبال (اردو و فارسی) پر لکچر دے رہا ہوں۔ لکچر کے لیے کلام اقبال کے مطالعہ کے دوران مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ شکوہ اور جواب شکوہ کو کلام اقبال میں ایک خاص پس منظر کے تناظر میں خصوصی اہمیت حاصل ہے اور اس کے الفاظ کے در و بست میں جو درد نہاں ہے اس کا ادراک اسی وقت ممکن ہے جب اقبال کے فارسی اور اردو کلام کی روشنی میں اس کی تشریح کی جائے۔ چنانچہ میں نے بطور تمہید اس سلسلہ میں کام کا آغاز کیا۔ اس زمانہ میں عالمی رابطہ ادب اسلامی لکھنؤ کے زیر اہتمام کاشف العلوم اورنگ آباد میں ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ میں نے اس سیمینار کے لیے ''شکوہ اور جواب شکوہ: ایک مطالعہ'' کے موضوع کا انتخاب کیا اور اس طرح یہ مضمون بہ عجلت ممکنہ پایہ تکمیل کو پہونچا۔ اس

سیمینار کا مرکزی موضوع تھا 'ملت اسلامیہ کے مسائل و قضایا علامہ شبلی اور ان کے معاصر شعراء کے کلام میں' اور تاریخیں تھیں ۲۹-۳۰ نومبر و یکم دسمبر ۲۰۱۳ء مطابق ۲۵-۲۶-۲۷ محرم ۱۴۳۵ھ کی۔ سیمینار کی دوسری نشست میں یہ مقالہ پیش کیا گیا اور بعد میں اورنگ آباد کے مشہور روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز میں کئی قسطوں میں چھپا اور قارئین نے اسے بہ نظر استحسان دیکھا۔ اب نظر ثانی کے بعد یہ مضمون کتابی شکل میں معہد الدراسات الاسلامیہ العالمیہ کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے چشم کشا ثابت ہوگی جو فکر اقبال سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کے کلام کے دریچہ سے اس کے نہاں خانہ دل میں جھانکنا چاہتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو چشم بینا گوش شنوا اور قلب بریاں کی دولت لازوال سے بہرہ ور فرمائے کہ اقبال کی ساری تگ و دو اسی تثلیث کے لیے تھی۔ یہ کتاب شکوہ اور جواب شکوہ کی شرح نہیں ہے بلکہ اس میں شکوہ اور جواب شکوہ کی روح کو اقبال کے فکری اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی البتہ قارئین کی دلچسپی کے لیے مکمل شکوہ و جواب شکوہ کو کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے نفع کو عام فرمائے۔ وما علینا الا البلاغ.

تاریخ: ۱۰ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ
۲۴ اکتوبر ۲۰۱۵ء، بروز شنبہ

(ڈاکٹر) محمد صدر الحسن ندوی مدنی
صدر اقبال اکیڈمی اورنگ آباد،
نزیل ہوٹل ریور ویو دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ اقبال (پیدائش ۹/نومبر ۱۸۷۷ء بمقام سیالکوٹ، وفات ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء بمقام لاہور) کی شاعری ہندوستان کے عظیم شاعر غالب کی شاعری کی طرح زندگی کو صرف آئینہ نہیں دکھاتی بلکہ زندگی کو ایک سمت اور میلان عطا کرتی ہے۔

بگیر امروز را محکم کہ فردا
ہنوز اندر ضمیر روزگار است

یہی وجہ ہے کہ اردو اور فارسی میں کوئی شاعر تنوع افکار اور ثروت تصورات میں اقبال کا مقابلہ نہیں کرسکتا، فلسفہ قدیم ہو یا فلسفہ جدید، تصوف کے افکار ہوں یا معاشرتی تصورات، اخلاقی مسائل ہوں یا معاشی تخیلات، اقبال نے ان تمام حقائق کو اپنے آفاقی، ہمہ جہت اور غیر متزلزل شعور میں غوطہ دے کر اپنے فکر وفن کو انسان کی عظمت، خودی، خودشناسی، خودگری خودنگری اور خودآگہی سے اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ اس کی شاعری دیر وحرم، کعبہ و سومنات، فقر وقلندر، فکر ونظر، لالہ وطور، عشق وعقل، نرگس وشاہین، حسن وعشق، انفس وآفاق، مشرقیت ومغربیت، کوہ وصحرا، چراغ وشرار کے بحر ناپیدا کنار میں غواصی اور شناوری کے لیے انسان کی داخلی اور وجدانی صلاحیتوں کو فکر روشن اور دل بیدار عطا کرتی ہے۔

اقبال نے بجا طور پر اپنے ایک خط میں اس کا اظہار بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور

بس''۔ (اقبال نامہ ص ۱۰۸)

اقبال نے اسرار خودی (اشاعت ۱۹۱۵ء) رموز بے خودی (اشاعت ۱۹۱۸ء) پیام مشرق (اشاعت ۱۹۲۳ء) بانگ درا (اشاعت ۱۹۲۴ء) زبور عجم (اشاعت ۱۹۲۷ء) جاوید نامہ (اشاعت ۱۹۳۲ء) مسافر (اشاعت ۱۹۳۴ء) بال جبرئیل (اشاعت ۱۹۳۵ء) ضرب کلیم (اشاعت ۱۹۳۶ء) پس چہ باید کرد (اشاعت ۱۹۳۶ء) ارمغان حجاز (اشاعت ۱۹۳۸ء) کے ذریعہ حدیث دل کو حدیث کائنات بنا کر دل گدازی اور دل کشائی کے جلوہ ہزار رنگ سے اردو ادب ہی نہیں بلکہ عالمی ادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کا قابل فخر اور سزاوار تقلید کارنامہ انجام دیا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے غزل کو شاعری کی آبرو کہا ہے اور کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف سخن سے تعبیر کیا ہے لیکن بقول جگن ناتھ آزاد غزل ہماری شاعری میں سب کچھ نہ سہی پھر بھی بہت کچھ ہے۔ اسی طرح نظم بھی بہت کچھ ہے۔

غزل کے علاوہ اقبال نے اپنی شاعری (نظم) میں ہیئت کے کثرت سے تجربات کیے ہیں۔ ہیئت سے مراد کسی نظم کی ظاہری شکل وصورت ہے جیسے مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع، معشر، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، قطعہ، مثنوی یا غزل کی ہیئت میں نظمیں، تضمین وغیرہ۔ اقبال نے غزل سرائی ضرور کی ہے لیکن اقبال نے نظم کو جس رفعت و بلندی سے ہم کنار کیا اور خیالات وتصورات کے جس بام عروج تک پہونچایا اور نظم میں ہیئتوں کے جن تجربات سے وہ خود گذرے وہ اقبال ہی کا حصہ ہے۔ نظم میں اقبال کے یہاں جن ہیئتوں کا استعمال زیادہ ہے وہ مثنوی، ترکیب بند اور مسدس ہیں۔ بانگ درا میں نظموں کی تعداد ایک سو چوالیس اور غزلوں کی تعداد اٹھائیس ہے، بال جبرئیل میں نظموں کی تعداد باسٹھ

اور غزلوں کی تعداد چھہتر (۷۶) ہے، ضرب کلیم میں ایک سو انتالیس نظمیں ہیں اور پانچ غزلیں ہیں۔ ارمغان حجاز میں نو نظمیں ہیں اور اٹھارہ غزلیں، اس طرح کلیات اردو میں نظموں کی کل تعداد تین سو چون اور غزلوں کی تعداد ایک سو ستائیس (۱۲۷) تک پہونچتی ہے۔

اقبال نے ابتدائی دور کی نظموں میں زیادہ تر مسدس کی ہیئت اختیار کی۔ وطنیت، نالۂ فراق، آفتاب صبح، موج دریا اور شکوہ اور جواب شکوہ مسدس کی ہیئت میں ہیں۔

بانگ درا میں تین ادوار کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ بانگ درا کے حصۂ اول میں ۱۹۰۵ء تک کے کلام کو شامل کیا گیا ہے جس میں ہمالہ، گل رنگیں، عہد طفلی، مرزا غالب، ابر کوہسار، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد، خفتگان خاک سے استفسار، شمع و پروانہ، عقل و دل، صدائے درد، آفتاب، شمع، ایک آرزو، آفتاب صبح، درد عشق، گل پژمردہ، سید کی لوح تربت، ماہ نو، انسان اور بزم قدرت، پیام صبح، عشق اور موت، زہد اور رندی، شاعر، دل، موج دریا، رخصت اے بزم جہاں، طفل شیر خوار، تصویر درد، نالۂ فراق، چاند، بلال، سرگذشت آدم، ترانۂ ہندی، جگنو، صبح کا ستارہ، ہندوستانی بچوں کا گیت، نیا شوالہ، داغ، ابر، ایک پرندہ اور جگنو، بچہ اور شمع، کنار راوی، التجائے مسافر اور غزلیات شامل ہیں۔ مجموعی طور پر اس دور کے اشعار کی تعداد آٹھ سو چھیاسٹھ (۸۶۶) ہے۔

بانگ درا کا حصہ دوم علامہ کی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔ جن میں محبت، حقیقت حسن، پیام، سوامی رام تیرتھ، طلبہ علی گڑھ کالج کے نام، اختر صبح، حسن و عشق، ..... کی گود میں بلی دیکھ کر، کلی، چاند اور تارے، وصال، سلیمیٰ، عاشق ہرجائی، کوشش ناتمام، نوائے غم، عشرت امروز، انسان، جلوہ حسن، ایک شام، تنہائی، پیام عشق، فراق،

عبدالقادر کے نام اور صقلیہ جیسی نظمیں شامل ہیں جن میں اشعار کی کل تعداد دو سو اکیس (۲۲۱) ہے۔

بانگ درا کے حصہ سوم کا کلام ۱۹۰۸ء سے مابعد کے کلام پر محیط ہے۔ جس میں بلاد اسلامیہ، ستارہ، دو ستارے، گورستان شاہی، نمود صبح، تضمین بر شعر انیسی شاملو، فلسفہ غم، پھول کا تحفہ عطا ہونے پر، ترانہ ملی، وطنیت، ایک حاجی مدینہ کے راستہ میں، قطعہ، شکوہ، چاند، رات اور شاعر، بزم انجم، سیر فلک، نصیحت، رام، موٹر، انسان، خطاب بہ جوانان اسلام، غرّہ شوال، شمع اور شاعر، مسلم، حضور رسالت مآب میں، شفاخانہ حجاز، جواب شکوہ، ساقی، تعلیم اور اس کے نتائج، قرب سلطان، شاعر، نوید صبح، دعا، عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں، فاطمہ بنت عبداللہ، شبنم اور ستارے، محاصرہ ادرانہ، غلام قادر، روہیلہ، ایک مکالمہ، میں اور تو، تضمین بر کلام ابوطالب کلیم، شبلی و حالی، ارتقا، صدیق، تہذیب حاضر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، شعاع آفتاب، عرفی، ایک خط کے جواب میں، نانک۔ کفر اور اسلام، بلال، مسلمان اور تعلیم جدید، پھول کی شہزادی، تضمین بر شعر صائب، فردوس میں ایک مکالمہ، مذہب، جنگ یرموک کا ایک واقعہ، مذہب، پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ، شب معراج، پھول، شیکسپیئر، میں اور تو، اسیری، دریوزہ خلافت، ہمایوں، خضر راہ، طلوع اسلام، غزلیات، ظریفانہ جیسی نظمیں شامل ہیں۔ اس حصہ میں اشعار کی کل تعداد تیرہ سو چودہ (۱۳۱۴) ہے۔

حالی، اسماعیل میرٹھی اور اکبر الہ آبادی نے جس اصلاحی شاعری کی بنیاد ڈالی تھی، علامہ اقبال اس تسلسل کے امین و نقیب تھے۔ بانگ درا کے حصہ دوم کی شاعری کا تعلق علامہ اقبال کے قیام یورپ کے زمانہ (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء) سے ہے۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۰۸ء کو علامہ اقبال یورپ سے جب لاہور پہنچے تو ان کے دور سوم کی شاعری کا آغاز ہوا۔ شکوہ اور جواب

شکوہ اسی دور سوم کی یادگار ہے۔ اپریل ۱۹۱۱ء کے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں اقبال نے ایک سحر انگیز لے میں ندرت تخیل کے اس شاہ کار کو جب پڑھنا شروع کیا تو سارے مجمع پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری ہوگئی اور دوسرے سال ۱۹۱۲ء میں باغ بیرون موچی دروازہ لاہور میں ایک عظیم الشان اجلاس میں اقبال کے طائر تخیل کی پرواز ''جواب شکوہ'' کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

اقبال کی تخلیقی عمر چالیس سالوں پر محیط ہے۔ اس زمانی عرصے میں ان کے فکر وفن نے انسانی عظمت، خودشناسی، خودآگہی اور خوداظہاری کو ثریا کی بلندیوں تک پہونچا دیا اور نئی لفظیات کے ساتھ ایک نئے اور پرشکوہ آہنگ سے اردو شاعری کو مالا مال کیا۔ اس جدید آہنگ کے ایک ایک پہلو میں ایسی جرأت رندانہ پنہاں ہے جس نے شکوہ میں سوز وگداز اور بے تکلفانہ راز و نیاز کی صورت اختیار کرلی ہے اور راز و نیاز کی یہی لذت اقبال کو شکوہ کی جرأت عطا کرتی ہے۔ ایسا شکوہ جس میں حسن ادا ہے، ندرت تعبیر ہے، حد ادب ہے، دل رنجور کی کسک اور ایمان وعشق کی تابانی اور دمک موجود ہے۔ شکوہ کا یہ مکالماتی اسلوب اقبال کے عشق جنوں پرور اور جذب سرور انگیز کی ایک قلندرانہ تعبیر ہے۔ یہ ''من و یزداں'' کے درمیان لطف مناجات کا حسین مرقع' مینائے غزل میں ذرا سی باقی مے کا رندانہ اظہار اور من و تو کا بے باکانہ امتزاج ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

پھر فرماتے ہیں

روز حساب جب میرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرم سار ہو مجھ کو شرم سار کر

اسی طرح یہ رنگ بھی ملاحظہ ہو

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

جرأت کا یہ پہلو بھی قابل توجہ ہے

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

تعبیر کی یہ طرفگی بھی غور طلب ہے

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا میرا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

شکوہ اقبال کا شیوہ نہیں لیکن

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

شکوہ اکتیس بند پر مشتمل ہے اور ہر بند مسدس ہے اور جواب شکوہ میں مسدس پر مشتمل چھتیس بند ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کی شاعری کا محور ''خودی'' ہے

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

اور اسی راہ خودی کی تلاش کی آبلہ پائی، صحرانوردی اور بادیہ پیمائی اقبال کو شکوہ سنجی اور گاہ نیم برہنہ گوئی کے پل صراط تک لے گئی جس سے وہ کامرانی و سرخروئی کے ساتھ گذرے ہیں۔

شکوہ اور جواب شکوہ کی روایت ہمیں عربی زبان میں بھی ملتی ہے۔ حافظ محبّ الدین ابن النجار (وفات ۶۴۳ھ) نے الذیل علی تاریخ بغداد (۱۰۲:۱) میں عبدالملک بن عبدالسمیع ہاشمی کے حالات میں شیخ شبلی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ شیخ جنید نے فرمایا کہ میں ایک بار بغداد کے ایک محلّہ درب القراطیس سے گذر رہا تھا کہ ایک مکان سے گانے کی آواز آئی۔ غور کیا تو کوئی کنیز یہ اشعار گا رہی تھی۔

اذا قلت: اهدی الهجر لی حلل البلی
تقولین: لولا الجهر لم یطب الحب

جب میں شکوہ سنج ہوتا ہوں کہ ہجر و فراق نے مجھے لاغر و ناتواں کر دیا ہے تو اس شکوہ کے جواب میں تم یہ کہتی ہو کہ محبت کا لطف ہجر و فراق کے سبب ہی تو دوآتشہ ہوتا ہے۔

وان قلت: هذا القلب احرقه الهوی
تقولی: بنیران الهوی شرف القلب

اور اگر میں یہ کہتا ہوں کہ آتش عشق نے اس دل کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے تو تم جواب شکوہ میں

یہ کہتی ہو کہ عشق کی آتش سوزاں کی بدولت ہی تو دل کو یہ عظمت و توقیر حاصل ہوتی ہے۔

وان قلت: ماذنبت؟ قلت مجیبة
حیاتک ذنب لایقاس به ذنب

اور اگر میں اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہتا ہوں کہ آخر میری خطا کیا ہے تو تم جواب شکوہ میں یہ کہتی ہو کہ تمہارا وجود ایسی خطائے مسلسل ہے کہ دوسری کوئی خطا اس کی ہم سری نہیں کر سکتی

۱۸۷۹ء میں خواجہ الطاف حسین حالی نے مدوجزر اسلام (مسدس حالی) میں جس طرح امت مسلمہ کے زوال کی روداد اور مرض کی تشخیص کی ہے اسی طرح علامہ اقبال نے شکوہ میں مرض کی تشخیص کی ہے اور جواب شکوہ میں اس کا علاج تجویز کیا ہے۔ خضر راہ (۱۹۲۴ء) اور طلوع اسلام میں اقبال نے عظمت اسلام کی بازیابی کے لیے جو نسخۂ کیمیا پیش کیا ہے وہ اسلام اور پیغمبر اسلام سے گہری وابستگی اور رنگ و نسل کے دام ہم رنگ زمین سے مکمل بیزاری اور علم و عمل کے تیغ جوہردار سے آراستگی میں مضمر ہے۔ آج نسل، قومیت، تہذیب اور رنگ کے مختلف خانوں میں انسانوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آج اولاد آدم میں جغرافیائی اور تہذیبی رقابت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ آپس میں دست و گریباں ہیں۔ آج مسلمان اپنی میراث سے بے بہرہ ہیں اور تثلیث کے فرزندوں نے ریاضی، فلسفہ، تاریخ اور طب کے میدان میں مسلمانوں کی ایجاد و اختراع کو اپنا کر کائنات کو اپنی جولانگاہ بنا لیا ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

اسی لیے اقبال اس حقیقت کے اظہار میں حق بہ جانب ہیں کہ:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحران لالہ روست — نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست
محکمی او را نہ از لادینی است — نے فروغش از خط لا دینی است
قوت افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

اسی لیے علامہ اقبال امت مسلمہ کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ علم و عمل کے زیور سے آراستہ ہوں۔

جستجو را محکم از تدبیر کن — انفس و آفاق را تسخیر کن
علم اشیاء اعتبار آدم است — حکمت اشیاء حصار آدم است

اسی طرح اقبال مادی خوش حالی کے خلاف بھی نہیں ہیں ان کے نظریہ فقر کے خمیر میں دست نگری اور رنجوری نہیں ہے ہاں وہ اس روش کے خلاف ہیں جو انسان کو نفسانی خواہشات کا اسیر بنا دیتی ہے

حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے
تجھ کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے

اقبال کو انیسویں اور بیسویں صدی کا عالم اسلام اور ہندوستان ورثہ میں ملا تھا۔ اس دورانیہ میں امت مسلمہ جس شکست وریخت سے دوچار ہوئی اس کے اسباب علامہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں:

''اسلام کی تاریخ دیکھو وہ کیا کہتی ہے؟ عرب کے خطے کو یورپین معماروں نے ردی اور بے کار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہوسکتی۔ ایشیا اور یورپ کی قومیں عرب سے نفرت کرتی تھیں، مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا تو پھر یہی پتھر دنیا کے ایوان تمدن کی محراب کی کلید بن گیا۔ اور خدا کی قسم روما جیسی

باجبروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جو اپنے بل پر کھڑی ہوئی۔ انھیں چاہیے کہ اپنے خدا، اپنے رسول، اپنے دین اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ رکھیں''۔ (جلسہ عام بیرون موچی دروازہ لاہور یکم فروری ۱۹۱۲ء)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اقبال کی شاعری کا تیسرا دور الہامی دور ہے۔ اس دور میں ان پر یہ آشکارا ہو چکا تھا کہ امت مسلمہ اس وقت اگرچہ زوال آشنا اور مرد بیمار ہے اور وہ خدا بیزاری، مغربی تہذیب کے دلدادہ، یورپ کی کورانہ تقلید، مذہب سے پہلوتہی اور قرآن وحدیث سے دوری اور نفس پرستی کی گرداب میں گرفتار ہے لیکن اصلاح کی ادنی سی جنبش اسے اوج ثریا تک پہونچا سکتی ہے۔ اسی لیے وہ امت مسلمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں فانی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنابند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال نے شکوہ میں امت مسلمہ کے تئیں جس دردمندی اور فکرمندی کا اظہار کیا ہے اس کی اساس یہ ہے کہ اس وقت امت مسلمہ دین اور دینی شعائر سے دوری کے نتیجہ میں ذہنی و فکری ارتداد، کفر و الحاد اور لادینیت کا شکار ہو رہی ہے اور جدید تعلیم کی عصری دانشگاہوں کے زیر اثر نوجوانوں کے دماغوں میں ایک قسم کی تشکیک گھر کر رہی ہے اور اسلامی تہذیب سے دوری اور بیزاری کے نتیجہ میں غیر اسلامی اور مغربی تہذیب وجہ افتخار بنتی جا رہی ہے۔ اس تناظر میں اقبال نے امت مسلمہ کو یہ پیغام دیا ہے کہ:

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ ترے زمان و مکاں اور بھی ہیں

جواب شکوہ اور شکوہ میں اقبال کے پیرایہ بیان میں حد درجہ کی سادگی و پرکاری ہے اور یہ سادگی ہی ان کے جذبات کی شدت، احساسات کی گیرائی، انفعلات کی جولانی اور فطرت کی ناشکیبائی کو وہ گویائی عطا کرتی ہے کہ سماعت وجد کرنے لگتی ہے اور دنیائے تخیلات

انگشت بہ دنداں ہو جاتی ہے۔

اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

لیکن علامہ اقبال اس امر کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بہ دہن ہے مجھ کو

اقبال کا شکوہ زیاں کاری، سود فراموشی، غم دوش، نالۂ بلبل اور مہر بہ لب گل کے حدود و قیود کے وحشت زدہ زنداں سے بیابان و گلستان کی فرحت بخش اور جاں فزا، فضاء میں قدم رکھنے کی جرأت رندانہ کرتا ہے اور پھر یوں شکوہ سنج ہوتا ہے کہ اے رب کائنات اور مالک ذوالجلال تری ذات قدیم تو ازل سے موجود تھی گل و لالہ زیب چمن تھے لیکن اس کی بوئے دل آویز مشام جاں کو معطر کرنے سے قاصر تھی۔ اگر ہماری دیوانگی نہ ہوتی تو اس کائنات میں ترے وجود کا غلغلہ کون بلند کرتا۔ اے رب العالمین ہم سے پہلے ترے جہاں رنگ و بو کی کیفیت کچھ یوں تھی کہ کہیں سنگ و خشت کی پرستش کی جا رہی تھی تو کہیں شجر و حجر معبود بنے ہوئے تھے۔ ہر پیکر محسوس کے آگے انسانوں کی جبیں نیاز خم ہو رہی تھی۔ اس معمورہ کی سطح پر سلجوقی، تورانی، ساسانی، چینی، یونانی، یہودی اور نصرانی زندگی کے شب و روز میں ترے خوان یغما سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن ترے نام کی عظمت و توقیر کے نام پر اپنی جان عزیز کی قربانی کس نے پیش کی۔ جانکاہ خشکیوں، تپتے ہوئے صحراؤں، تلاطم خیز دریاؤں، یورپ کے کلیساؤں اور تلواروں کی چھاؤں میں ہر دل پر نقش توحید بٹھانے کا مقدس فریضہ کس نے انجام دیا۔

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

اقبال امت مسلمہ کے زرین کارناموں، اس کی اولوالعزمیوں، سرفروشیوں اور کارزار جہاں میں اس کی جاں کاہیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں

تو ہی کہدے اکھاڑا در خیبر کس نے — شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے — کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو

شکوہ اور جواب شکوہ میں غنائیت اور سبک خرامی لفظیات کی اشوہ خیزی کا نتیجہ ہے۔ ہم وزن لفظوں، اندرونی قوافی اور الفاظ و اصوات کی تکرار نے کلام میں ایسی لطافت پیدا کردی ہے کہ معانی الفاظ کا پیکر اختیار کر لیتے ہیں اسی لیے کہ شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ الفاظ و معانی میں ہم آہنگی پیدا کر کے قاری کو اپنے افکار و تخیلات کی موج بلا خیز کے حوالے کردے۔ لطیف معانی اور جذبہ طاعت و انکساری بلکہ جان گدازی اور جاں سپاری کی کیفیت کے اظہار کا کامیاب ترین پیرایہ بیان اقبال کے یہاں ملتا ہے۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

رزم کی داستان ہو یا بزم عیش و نشاط کی تصویر کشی اقبال کی جدت طرازی دونوں میدانوں میں اپنی طرفگی اور دزدیدہ نگاہی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ شکوہ میں اسلاف کے رزمیہ کارناموں کے اظہار کے لیے ''اڑ'' ''اکھڑ'' ''بگڑ'' اور ''لڑ'' جیسے شوریدہ اور پرآہنگ الفاظ کا استعمال کر کے اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کس خوبی سے کیا ہے:

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے — پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہو کوئی تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

اقبال نے زمانی و مکانی وسعتوں کے اظہار کے لیے الف ممدودہ کے صوتی پھیلاؤ سے جا بجا کام لیا ہے۔ شکوہ کے ان اشعار میں اسلاف کی اولوالعزمیوں کے اظہار کے لیے اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں تھی:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

شکوہ ہو یا جواب شکوہ اقبال نے ان دونوں نظموں میں جن اشارات و علامات سے کام لیا ہے ان سے خیالات و افکار کے اظہار کے ساتھ پیغام کی ترسیل و ابلاغ کا فریضہ بھی مکمل طور پر ادا ہو جاتا ہے اور اقبال کا پیغام کیا ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زبان سے سنئے:

اے خوابیدہ کلی تو اس نرگس بیدار کی طرح آنکھ کھول جس کی آنکھیں کبھی نہیں جھپکتی اور جسے کبھی نیند نہیں آتی۔ دشمنوں نے ہمارے مستقر پر حملہ کیا ہے اور ہمیں خانماں برباد کر کے رکھ دیا ہے، کیا بلبل کی نغمہ سنجی، اذان کی للکار اور قلب و روح کی پکار بھی تمہیں بیدار نہیں کر سکتی، آفتاب نے پھر از سر نو رخت سفر باندھا اور ظلمات کے سمندر میں صبح روشن کے پتوار حرکت میں آ گئے، کاروانوں نے وادی، صحرا میں اپنے اسباب اٹھا لیے اور کوچ کا نقارہ بج گیا لیکن اے چشم بیدار جو انسانیت کی نگراں اور کمزوریوں کی پاسباں تھی تو ابھی تک سو رہی ہے اور ذرا بھی نہیں دیکھتی کہ حالات و حوادث میں کیا انقلاب آ گیا تیرا سمندر صحرا کی طرح ساکن ہو گیا اور جوش و طغیانی کی جگہ اس میں جمود پیدا ہو کر رہ گیا ہے، اس میں کوئی مد و جزر نہیں اس کی موجوں میں کوئی تلاطم نہیں، یہ کیسا سمندر ہے جس میں نہ کوئی نہنگ حوصلہ مند ہے اور نہ کوئی موج بلند، تمہارے پرشور سمندر کو تو اپنے ساحل سے نکل کر دشت و جبل میں پھیل جانا تھا۔

اے مرد مسلماں تو ناموس ازل کا امین و پاسباں اور خدائے یزداں کا راز داں ہے، تیرا ہاتھ تو خدا کا ہاتھ ہے تیری اٹھان مٹی سے ہے لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقاء متعلق ہے۔ اذعان و یقین کے جام چڑھا اور ظن و تخمین کی پستیوں سے بلند ہو جا، فرنگ کی دل آویزی کی نہ داد ہے نہ فریاد، جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور شکستہ و رنجور بنا دیا ہے، فریادان بازی گروں سے جو کبھی ناز و انداز سے پکڑتے اور کبھی بیڑیوں سے جکڑتے ہیں کبھی شیریں کا کردار ادا کرتے ہیں اور کبھی پرویز کا روپ بھرتے ہیں۔ دنیا ان تباہ کاریوں سے ویرانہ ہو گئی۔

اے بانی حرم! اے معمار کعبہ! اے فرزند ابراہیم ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لیے اٹھ اور اپنی گہری نیند سے بیدار ہو۔ (نقوش اقبال)

اقبال کا کلام جمالیاتی حسن کا مرقع ہے شکوہ میں جا بجا اس حسن کی دلآویزی جلال و

جمال کے ساتھ سایہ فگن ہے

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادۂ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفت قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیٔ آئین وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

اضطراب کے اظہار کے لیے قبلہ نما کی تعبیر کس قدر اچھوتی ہے۔ اقبال نے اپنے ایک شعر میں کرن کی تعریف میں اضطراب و شوخی کو نگہ حور سے تشبیہ دی ہے

ایک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب

اقبال کو اس کا ادراک ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا سبب قرآن و سنت سے دوری اور تن آسانی ہے

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ انداز مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اقبال قوموں کے عروج وزوال کے فلسفہ کا رمز شناس تھا۔ ملت اسلامیہ کی درخشاں تاریخ پر ان کی نظر تھی وہ اسلاف کے کارناموں اور ان کے شکوہ وجلال کے محافظ وامین تھے۔ اس تناظر میں موجودہ مسلمانوں کی حالت زار اور راہ عمل سے دوری کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو
ہونکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

خویش پروری، فرقہ بندی اور ذاتی مفاد کو حکیم اقبال امت اسلامیہ کے لیے زہر ہلاہل اور سم قاتل قرار دیتے ہیں اور اسے ترقی اور عروج کی راہ میں حائل کوہ گراں سمجھتے ہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کئی ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

وہ مسلمانوں میں مغربی تہذیب کی اثر پذیری اور ہندوستان کے دیومالائی عقائد

کے اثرات سے دل گرفتہ ہیں۔ اس لیے اس تناظر میں فرماتے ہیں:

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاری تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

شکوہ اگر مسائل کے انبار کا امین ہے تو جواب شکوہ مسائل کے حل کا نسخہ کیمیاء۔ اقبال کا پیغام دراصل اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ اپنے وقیع موضوع، مطالعاتی اسلوب، تصنع اور تکلف سے پاک انداز تخاطب اور نادر پیرایۂ بیان کی بنا پر اقبال کے ذہن افروز فکر اور دل نواز فن کے کمالات کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے اس میں عبرت و موعظت کے ہزار پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک مہمیز اور تازیانہ کی صفت سے متصف ہے

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

اس نظم میں اقبال کا شعری آہنگ اچھوتا اور انداز بیان واضح اور براہ راست ہے کیونکہ

موضوع اور مطالعاتی طرز کا یہی تقاضہ تھا۔ اقبال کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں مواد و موضوعات کے لحاظ سے نظم کی ہیئت کو متنوع پیچ وخم کی وادیوں کی آماجگاہ بنایا ہے جس طرح جوئے سرود آفریں میکدۂ بہار کی شراب لالہ گوں سے بدمست ہوکر کوہسار سے خوش خرامی کے دوش پر سوار ہوکر سبزۂ مرغ زار کی آغوش میں پناہ گزیں ہوجاتی ہے۔ اسی طرح نظم کی ہیئت کو اقبال نے کہیں نغمہ وسرود کہیں مکالمہ، گاہ کردار نگاری، کہیں خود کلامی، کہیں منظر نگاری اور کہیں بیانیہ کا پیکر سیمیں عطا کر کے اس کے حسن کو نہ صرف دوبالا کر دیا ہے بلکہ رشک صد بہار بنا دیا ہے۔

جواب شکوہ کے آخری بند میں اقبال نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے جو شکوہ اور جواب شکوہ کا مسک الختام ہے۔ اقبال بہ زبان بارگاہ ایزدی مسلمانوں سے مخاطب ہوکر یوں عرض کناں ہیں کہ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تم میں اس کائنات کو مسخر کرنے، ترقی و کامرانی کی راہوں کو اپنی جولانگاہ بنانے، طنطنۂ سکندری، سحر سامری، تہذیب نو کی قاہری اور تمدن کی دل بری کے مقابلہ کے لیے دوشہپر عطا کیے ہیں۔ ایک عشق کی قوت ناپیدا کنار اور دوسرے عقل کی پرواز صبا رفتار، تو عشق کو اپنی تلوار اور عقل کو اپنی ڈھال بنالے اس وقت تیری تدبیر ہماری تقدیر سے ہم آہنگ ہوجائے گی اور تقدیر و تدبیر میں ہم آہنگی کے ساتھ اگر تیری زندگی اتباع محمد ﷺ کا عملی نمونہ بن گئی تو اس دنیائے دوں کی کیا حقیقت ہے ہم ساری کائنات کی زمام کار تمہارے سپرد کر دینگے۔

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہاں گیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہوتو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبال کے کلام و پیام نے آہوئے رمیدہ کو سوئے حرم لے جانے کی جو کوشش ناتمام کی ہے اس کی نتیجہ خیزی روز بہ روز ایک حقیقت بنتی جارہی ہے اور اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے جن ''نسخہ ہائے وفا'' کے ساز پر زندگی بھر اقبال زخم زنی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ کل سے زیادہ آج اس کی اہمیت محسوس کی جارہی ہے بلکہ اسی شدت احساس کا نتیجہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اقبال کے خدنگ فکر کے نیم کشتہ افراد اپنے مقدر کے ستارے کو اقبال کی کارگہ فکر میں تلاش کرنے پر مجبور ہیں۔ اقبال نے احترام انسانیت اور ارتقائے آدم کے میدان میں جو ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے پوری اردو اور فارسی شاعری میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ اور ہدف کی یک سمتی نے تو اسے اور دوآتشہ بنا دیا ہے۔

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اردو شاعری میں اقبال نے شاید پہلی بار اپنی آتش خودی میں جلنے کے فن سے دنیائے شاعری کو روشناس کرایا، اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر:

جوئے خوں می چکد از حسرت دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کا حدی خواں اقبال امید ورجا کے بحر بے کراں میں غوطہ زن ہوکر، زمزمہ سنج ہوکر اسلام کی عظمت وسطوت کی حدی خوانی کا فریضہ ان الفاظ میں انجام دیتا ہے:

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

اور اسکی نے نوازی کبھی تار حیات کو یوں چھیڑتی ہوئی ظاہر ہوتی ہے۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے
کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصر نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

اقبال کا جوش جنوں پرور بڑا نشاط انگیز ہے۔ وہ خزاں گزیدہ چمن کو دیکھ کر معشوق و مے کی آغوش میں پناہ گزیں نہیں ہوتا بلکہ اس گلستان پژمردہ کو لالہ لب جو کی شادابی و شگفتگی عطا کرتا ہے۔ کشمکش حیات کی زہرہ گدازی اس کے کاروان سیماب پا کو اور تیز گام کرتی ہے اور حالات و واقعات کی ستیزہ کاری اس کی صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کی راہ کے لیے صدائے نے اور بانگ درا ثابت ہوتی ہے۔

میارا بزم برساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا خلط و باموجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

اقبال کا کلام صبح درخشاں کا نقیب سرود ازلی کا فروغ، خودنگر و خودگر و خودگیر خودی کا

سرور، خون جگر کا جلوۂ صد رنگ، ہنگام صبح، اختر سیماب پا کی نمود، بندۂ کنجشک و حمام کے لیے اعلان جنگ، تربیت گاہ بیاباں میں فاروقی و سلمانی کی صدائے بازگشت، خاموشی و دل سوزی اور سرمستی و رعنائی کا مرقع، چشم نادیدہ خواب کا حسین پیکر، لالہ ہائے جگر سوز کا سرسبد دل نواز، کارگاہ آشنائی کے در دولت کی شاہ کلید اور لذت تشنہ لبی کی حکایت دل پذیر ہے۔

بہ شاخ زندگی مانمی ز تشنہ لبی است
تلاش چشمۂ حیواں دلیل کم طلبی است

اقبال کا پیام ''تشنہ لبی'' معانی و افکار کا بحر ناپیدا کنار ہے۔

چو، موج ساز وجودم ز سیل بے پرواست
گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

اقبال نے جس عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے اپنے فکر و فن کی بوقلمونیوں سے در دل کو وا کرنے کی سعی مسلسل کی ہے اس کا راز وہ ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں

سر حق بر مرد حق پوشیدہ نیست
روح مومن ہیچ می دانی کہ چیست
قطرۂ شبنم کہ از ذوق نمود
عقدۂ خود را بہ دست خود کشود
از خودی اندر ضمیر خود نوشت
رخت خویش از خلوت افلاک بست
رخ سوئے دریائے بے پایاں نہ کرد
خویشتن را در صدف پنہاں نہ کرد

اندر آغوش سحر یک دم تپید
تا بہ کام غنچۂ نورس چکید

اقبال ان خوابیدہ صلاحیتوں کو بہ روئے کار لانے کی ترغیب دیتے ہیں جن سے عظمت انسانی کا ہیکل کالبدی تیار ہوا ہے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اقبال نے معمار جہاں کو گراں خوابی سے بیدار کرنے کے لیے زندگی کے راز ہائے نہاں اور سوز و ساز حیات کی حدیث بے کراں کا اظہار جس حکیمانہ اسلوب، خطیبانہ طرز، ناصحانہ ادا اور ساحرانہ تخاطب سے کیا ہے وہ اقبال کے جگر میں پیوستہ اس تیر نیم کش کی کسک کو ظاہر کرتا ہے جس کی تلخی وہ زندگی کے آخری مرحلہ تک محسوس کرتے رہے۔ وفات سے چند ہفتے پیشتر ۲/مارچ ۱۹۳۸ء کو بیماری کی حالت میں اقبال رات میں کافی دیر تک گریہ وزاری کرتے رہے، کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا: ''خدا جانے مسلمان قوم کا کیا حشر ہوگا مجھے اس کا خیال رہ رہ کر ستاتا ہے''۔

اقبال کی شاعری محض تشبیہات و استعارات اور گنجینہائے الفاظ و معانی کا پشتارہ نہیں بلکہ داخلی امکانات کی توسیع، ذہنی اور وجدانی تسخیر اور ایک انقلاب آفریں فکر کی پیش

قدمی کا تسلسل ہے اور اقبال کا فن اس ادبی روایت کا وارث ہے، رومی، سنائی اور عطار جس کے پیش رو تھے ورنہ محض آرائش الفاظ، بندش تراکیب، نزاکت معانی اور حسن تعبیر سے کوئی ادب خلعت جاوید سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔

اقبال کے ولولہ انگیز، فکر خیز اور نشاط افزا حجازی لے میں جو خون جگر شامل ہے وہی اس کے ادب کو دل نوازی اور اس کے فن کو بانکپن اور بقائے دوام عطا کرتا ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

حقیقت یہ ہے کہ شکوہ اور جواب شکوہ، جگر لہولہو کے معجزہ فن کی نمود ہے جو ذوق جستجو کے لیے مینارہ نور اور اقبال کے الفاظ میں بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

☆☆☆

شکوہ

سال تخلیق ۱۹۱۱ء

پیش کردہ بمقام انجمن حمایت اسلام لاہور

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے 'خاکم بدہن' ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ، تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم
پھول تھا زیب چمن، پر نہ پریشاں تھی شمیم؛
شرط انصاف ہے اے صاحب الطاف عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم؛

ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوبؐ کی دیوانی تھی؛

ہم سے پہلے تھا عجب ترے جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر؛

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی، تورانی بھی
اہل چیں چین میں، ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے — اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے — سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟
قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے — پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ — شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ — کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلب گار ہوئی؟ — اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاں دار ہوئی؟ — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟
منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے — مئے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے — اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

امتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہگار بھی ہیں — عجز والے بھی ہیں، مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں — سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے — ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے — اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں، ہیں ان کے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں، ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب

طعن اغیار ہے رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے؟

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے؟

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے

دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

دردِ لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی

عشق کا دل بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی
امت احمدؐ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی

پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی؟

تجھ کو چھوڑا کہ رسولؐ عربی کو چھوڑا؟
بت گری پیشہ کیا؟ بت شکنی کو چھوڑا؟

عشق کو، عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟
رسم سلمانؓ و اویسؓ قرنی کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشیؓ رکھتے ہیں

عشق کی خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی

مضطرب دل صفت قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندی آئین وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سر فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے
اک اشارے میں ہزاروں کے لیے دل تو نے

آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمی رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں؟
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں، تجھے یاد نہیں؟

وادی نجد میں وہ شور سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا

حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوے محفل ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے

دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ھو بیٹھے

اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز — لے اڑا بلبل بے پر کو مذاق پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز — تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کردے — مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کردے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کردے — ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کردے

جوئے خوں می چکد از حسرت دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما؛

بوئے گل لے گئی بیرون چمن، راز چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غماز چمن
عہد گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا ساز چمن — اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پرداز چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں — پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں — ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی، نہ مزہ جینے میں — کچھ مزہ ہے تو یہی خون جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبل تنہا کی نوا سے دل ہوں — جاگنے والے اسی بانگ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہد وفا سے دل ہوں — پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

جواب شکوہ

سال تخلیق ۱۹۱۲ء

پیش کردہ بمقام باغ بیرون موچی دروازہ، لاہور

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے — خاک سے اٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے

عشق تھا فتنہ گر و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

پیر گردوں نے کہا سن کے، کہیں ہے کوئی — بولے سیارے، سر عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں، اہل زمیں ہے کوئی — کہکشاں کہتی تھی، پوشیدہ یہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا — عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سر عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا — آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟

غافل آداب سے سکان زمیں کیسے ہیں!
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے — تھا جو مسجود ملائک یہ وہی آدم ہے؟
عالم کیف ہے، دانائے رموزِ کم ہے — ہاں، مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا — اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا — کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں — امتی باعث رسوائی پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں — تھا براہیمؑ پدر، اور پسر آزر ہیں

بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا — نازش موسم گل لالۂ صحرائی تھا!
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا — کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا

کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کر لو
ملت احمدؐ مرسل کو مقامی کر لو!

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے — ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمھیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے — تمھیں کہدو یہی آئین وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو — نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن، تم ہو — بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے!

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ — نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ — میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو؟

کیا کہا؟ بہر مسلماں ہے فقط وعدۂ حور — شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور — مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰؑ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک — ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک — کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

کون ہے تارک آئین رسول مختار؟ — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟ — ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب — زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب

امرا نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غرباء کے دم سے

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی! — برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی — فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلمان نابود — ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود — یہ مسلماں ہیں! جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

دم تقریر تھی مسلم کی صداقت بیباک — عدل اس کا تھا قوی، لوث مراعات سے پاک
شجر فطرت مسلم تھا حیا سے نمناک — تھا شجاعت میں وہ اک ہستی فوق الادراک
خود گدازی نم کیفیت صہبا لیش بود
خالی از خویش شدن صورت مینا لیش بود

ہر مسلماں رگ باطل کے لیے نشتر تھا — اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے قوت بازو پر تھا — ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو؛
پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو؛

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے — تم مسلماں ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم — تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم — پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم
تخت فغفور بھی ان کا تھا، سریر کے بھی
یوں ہی باتیں ہیں، کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار — تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار — تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے — بت ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
شوق پرواز میں مہجور نشیمن بھی ہوئے — بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے
ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لاکے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

قیس زحمت کش تنہائی صحرا نہ رہے — شہر کی کھائے ہوا، بادیہ پیمانہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے — یہ ضروری ہے، حجاب رخ لیلا نہ رہے
گلۂ جور نہ ہو، شکوۂ بیداد نہ ہو
عشق آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد ہو!

عہد نو برق ہے، آتش زن ہر خرمن ہے — ایمن اس سے کوئی صحرا، نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے — ملت ختم رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل برانداز ہے خون شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

امتیں گلشن ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں — اور محروم ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں — سینکڑوں بطن چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخل اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا — تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا — غیر یک بانگ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

نخل شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے — نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصر نورات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورش بلغاری کا — غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے، یہ ساماں ہے دل آزاری کا — امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری — ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری — کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثل بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا — رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو، ذرے سے بیاباں ہو جا — نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو! — چمن دھر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو — بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامن کہسار میں، میدان میں ہے — بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے — اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لك ذكرك دیکھے

مردم چشم زمیں، یعنی وہ کالی دنیا — وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمی مہر کی پروردہ ہلالی دنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری؛ مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری تو مسلماں ہے تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

فہرست مطبوعات معہد الدراسات الاسلامیہ العالمیہ، اورنگ آباد

International Institute of Islamic Studies (IIIS)

ڈاکٹر مولانا محمد صدر الحسن ندوی مدنی کے قلم سے

☆ اردو تصانیف:

(۱) خود پرستی یا خدا پرستی
(۲) اورنگ زیب اور تدوین فتاویٰ عالمگیری
(۳) اصلاح معاشرہ
(۴) زلزلہ اسباب اور علاج
(۵) زکوٰۃ کس طرح ادا کریں
(۶) اجتہاد، اہمیت اور ضرورت
(۷) فقہ اسلامی اور مستشرقین
(۸) والدین اور اولاد کے حقوق
(۹) شریعت کا مذاق کب تک!
(۱۰) مسائل جنازہ
(۱۱) آئینۂ تاریخ ادب عربی
(۱۲) تحفۂ رمضان
(۱۳) جمعہ فضائل، آداب، احکام، مسائل
(۱۴) رؤیت ہلال
(۱۵) اسلام میں عورتوں کے معاشی حقوق
(۱۶) دینی اور عصری تعلیم وقت کی ایک اہم ضرورت
(۱۷) انشاء اور ترجمہ میں مہارت کس طرح پیدا کریں
(۱۸) نشریات مدنی
(۱۹) مختصر علم میراث
(۲۰) فقہی اختلاف۔ اسباب و آداب
(۲۱) عربی کہاوتیں
(۲۲) شہر خجستہ بنیاد اورنگ آباد
(۲۳) بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
(۲۴) لازمی حق تعلیم قانون: ایک جائزہ
(۲۵) آثار الصنادید: ایک مطالعہ
(۲۶) شکوہ و جواب شکوہ: ایک مطالعہ
(۲۷) مکتوبات مدنی
(۲۸) مذاکرہ بین المذاہب

☆ عربی تصانیف:

(۱) المستشرقون و الفقه الاسلامی
(۲) الاسلام و المسلمون فی الهند

(۳) المستشرقون وتعدد زوجات النبی ﷺ

(۴) الاسلام والمستشرقون

(۵) الفرائد فی الفرائض

(۶) المستشرقون والاسلام

(۷) منافذ الحضارة الاسلامیه الی او ربا قبل عصر النهضة

(۸) ابوهریرة الصحابی المظلوم والمفتری علیه

(۹) المدائح النبویة فی الهند باللغة العربیة

(۱۰) موقف الاسلام من التامین

(۱۱) شمیم الادب

(۱۲) بدایة العربیة

(۱۳) نسیم الأدب

☆ انگریزی سے عربی میں ترجمہ:

(۱) الامبریا لیة الغربیة تهدد المسلمین (تحریر مریم جمیلہ)

☆عربی سے اردو میں ترجمہ:

(۱) راہ نجات: تحریر: جناح مبارک بن ماضی

(۲) اسلام امن عالم کا علم بردار اور دہشت گردی کا مخالف تحریر: جناح مبارک بن ماضی

(۳) ندوۃ العلماء کا قائدانہ کردار عربی زبان وادب کے میدان میں
تحریر: ڈاکٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

(۴) دعائے کبریت احمر: تحریر: شیخ محی الدین